ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

اقبالؒ کا فلسفۂ خودی

کس کو معلوم ہے ھنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانے ہیں مدّت سے خموش

فلسفۂ خودی کا دوسرا نام ہونا چاہیئے فلسفۂ فطرت یا فلسفۂ اسلام۔ کیونکہ اسلام فطرت انسانی کا ترجمان ہے اور فلسفۂ خودی انسان کی فطرت کا منظم عقلی تجزیہ ہے۔ قرآن نے اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

فطرۃ اللّٰہ التی فطرالناس علیھا   الخ

یعنی دینِ قیم یا اسلام انسان کی وہی فطرت ہے جس پر خُدا نے انسان کو پیدا کیا ہے۔

حدیث میں ہے:

(ما من مولودٍ الا یولد علیٰ فطرۃ اسلام۔ فابواہُ یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ۔)

یعنی ہر بچّہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

اقبال نے خودی کا لفظ استعمال کر کے انگریزی لفظ سیلف (SELF) کا جو مدّت سے فلسفہ کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، فارسی یا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ خودی سے مراد فقط شعور (CONSCIOUSNESS) ہے۔ شعور حیوان میں بھی موجود ہے۔ لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں، بلکہ قدرت کی مقرر کی ہوئی جبلتوں (INSTINCTS) کے ماتحت کام کرتا ہے۔ انسان کا شعور جبلّتوں سے آزاد ہو کر بھی کام کر سکتا ہے۔ انسان میں شعور کی آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں طلبِ حُسن یا جستجوئے کمال کا جذبہ موجود ہے۔ وہ طلب حسن یا جستجوئے کمال کی خاطر جبلتوں پر جبر کر سکتا ہے اور ان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے سوچتا، جانتا اور محسوس کرتا ہے، بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو

وہ جانتا بھی ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔ انسان میں اپنے شعور کو جاننے کی استعداد ہے۔ اس لئے اس کا شعور ایک قسم کی خود شعوری (SELF CONSCIOUSNESS) ہے۔ اسی خود شعوری کو اقبال خودی کہتا ہے۔

* * * *

افسوس ہے کہ خودی کی اس سادہ اور قدیم فلسفیانہ اصطلاح کے سمجھنے میں اکثر اقبال کے ایسے معتقدین کو بھی دقت پیش آتی ہے جو اقبال کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ اب تک فارسی اور اردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے یعنی تکبّر، خود پروری اور خود پرستی کے معنوں میں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی قوم کی خاص حالت کے پیشِ نظر خودی کے گوناگوں ازلی اور ابدی صفات میں سے صرف اس صفت پر زور دیا ہے جس کا ایک پہلو خود نمائی یا حُبّ استیلاء (SELF CONSCIOUSNESS) ہے۔

اس صفت کی رُو سے خودی ایک مدّعا پیدا کرتی ہے اور پھر اس مدّعا کے حصول کے لئے اپنی پوری قوتِ سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے وہ اپنے آپ کا اظہار کرتی ہے اور اس اظہار سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس بناء پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبۂ خود نمائی یا حصولِ قوت کے جائز یا ناجائز اظہار میں کوئی خاص خوبی ہے اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو اس جذبہ کا اظہار کیا جائے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ اس سلسلہ میں دو گزارشات ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ جد و جہد یا عمل سے خودی کو مکمل اور مستقل اطمینان (جو اُس کی پیہم ترقی اور ترفع کا ضامن ہو) اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب اس کا مقصد اچھا ہو۔ غلط مدّعا کی پیروی سے خودی کو عارضی طور پر تسلی ہو تو ہو لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جد و جہد آخر کار خود اس کے مقصد کو شکست دے دیتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ عمل یا جد و جہد احساسِ مدّعا کا لازمی نتیجہ ہے اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدّعا (خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا) رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا وہ ہر وقت عمل یا جد و جہد کرنے پر بھی مجبور ہے۔ غلط مدّعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدّعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو ہمارے صحیح مدّعا کے ماتحت ہو اور اس کے نزدیک صحیح مدّعا صرف مردِ مومن ہی کا امتیاز ہے گویا اقبال نے جو عملی جد و جہد اور خود نمائی پر زور دیا ہے اس سے آخر کار اس کی مراد یہی ہے کہ ہم اپنے مقصد اور مدّعا کو درست یا واضح بنائیں اور اسی کو وہ یقینِ محکم یا ایمان کہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس وقت تک کوئی عمل کر ہی نہیں سکتے جب تک کہ اُس عمل کے مطابق عقیدہ یا ایمان پیدا نہ کریں۔

اگر مدّعا شکوک و شبہات سے آزاد ہو کر قوی یا واضح ہو جائے تو وہی عزم یا ارادۂ عمل بن جاتا ہے ۔ ہمارا مرض اصل میں یہ نہیں کہ ہم عمل نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ ہم یقینِ محکم سے محروم ہیں ۔ بے عملی بے یقینی کے مرض کی ایک علامت ہے ۔

* * * * *

کائنات کے ساتھ انسان کی خود شعوری یا خودی کا کیا تعلق ہے ؟ وہ کیا چاہتی ہے ؟ اور جو چاہتی ہے وہ کیونکر حاصل کر سکتی ہے ؟ قرآن کا بنیادی مضمون یہی ہے اور فلسفہ بھی جب سے وجود میں آیا ہے ان ہی سوالات کا جواب تلاش کرتا رہا ہے ۔ کیونکہ ان کا جواب درحقیقت کائنات کے معمہ کا حل ہے ۔ گویا فلسفہ اور نبوّت عقل اور وحی کے دو مختلف راستوں سے ایک ہی منزل یعنی حقیقت عالم کی نقاب کشائی کی منزل کی طرف آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ اگرچہ نبوّت خاتم النبیینؐ کے ظہور سے پہلے اپنی منزل پر نہ پہنچ سکی تاہم اس کی رفتار کا ہر قدم صحیح راستہ پر اٹھتا اور صحیح منزل کی طرف بڑھتا رہا ۔ اس کے برعکس فلسفہ اگرچہ جزوی اور محدود کامیابیاں حاصل کرتا رہا لیکن مجموعی طور پر منزل سے دُور ٹھوکریں کھاتا رہا ۔ کیونکہ نبوّت کامل کی ہدایت کے بغیر صحیح قسم کے وجدان سے آغاز کرنا اور لہٰذا صحیح عقلی استدلال کو پانا اس کے بس کی بات نہ تھی ۔ نبوّت کی کوشش یہ تھی کہ انسان کو نظامِ عالم کی عقلی ترتیب کی تفصیلات میں لے جانے کی بجائے انسان کو اس کے ضروری حقائق کی واقفیت اس حد تک بہم پہنچا دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے عمل پر آمادہ ہو جائے جس سے وہ نہ صرف اپنی خودی کو مکمل اور مستقل طور پر مطمئن کر سکے بلکہ جس سے اس کے اندر وہ صحیح وجدان پیدا ہو جو نظامِ عالم کی عقلی ترتیب کو دریافت کرنے میں اس کی ٹھیک ٹھیک راہنمائی بھی کرے ۔ چنانچہ نبوّت اپنے کمال کو پہنچ کر بھی ہمیں نظامِ عالم کی عقلی واقفیت بہم پہنچانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ صرف اس اعلیٰ قسم کے وجدان کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے جو آخر کار اس واقفیت کے حصول کے لئے ضروری ہے اور جس کے بغیر عقلی استدلال کامل طور پر درست نہیں ہو سکتا ۔

فلسفہ نے ٹھیک سمجھا کہ نظامِ عالم ایک زنجیر کی طرح ہے ۔ جس کی ہر کڑی اگلی کڑی کے ساتھ ایک عقلی تعلق رکھتی ہے ۔ لہٰذا اسے یہی نظر آیا کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ زنجیرِ عالم کی ساری کڑیوں کو عقل کی مدد سے دریافت کر لے گا ۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ہر بار اپنے غلط وجدان ہی کو ایک منطقی زنجیر کی شکل دیتا رہا اور لہٰذا ہمیشہ ناکام رہا ۔ اگر فلسفہ ذرا جراَت سے قدم اٹھاتا اور نبوّت کامل کی ہدایت کو (جب وہ دنیا کے اندر موجود ہو چکی تھی) آگے بڑھ کر تھام لیتا تو اس کی پریشانیاں ختم ہو جاتیں اور وہ صحیح عقلی استدلال جو صدیوں سے اس کی جستجو کا مرکز رہا تھا اسے حاصل ہو جاتا ، لیکن جب تک فلسفہ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے چلتے ایک خاص مقام پر نہ پہنچ جاتا یہ دلیرانہ اقدام

اس کیلئے ممکن نہیں تھا خوش قسمتی سے اس بیسویں صدی میں علم طبیعات، علم الحیات اور علم النفس کے انکشافات کی وجہ سے فلسفہ کو یہ مقام حاصل ہو گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس نے اقبال کی ذات میں تعلیم نبوّت کے ساتھ پیوست ہونے کا دلیرانہ قدم بھی اٹھالیا ہے۔ اس صدی کے علمی انکشافات میں سے برگساں کا نظریۂ تخلیقی ارتقاء بالخصوص فلسفہ کو تعلیم نبوت کے بہت قریب لے آتا ہے۔ کیوں کہ اس نظریہ کا ضروری حصہ یعنی یہ کہ حرکتِ ارتقاء کا باعث خالق کائنات کا ارادہ ہے، تعلیم نبوّت کے مطابق ہے۔ اقبال فلسفۂ خودی کا موجد نہیں لیکن اقبال نے اس زمانے کے علمی انکشافات کی مدد سے نظریۂ خودی کو وہ شکل دی ہے جس کی وجہ سے موت اور فلسفہ پہلی دفعہ ایک دوسرے سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ گویا اقبال کے نظریہ کی شکل میں فلسفہ اپنی دو ہزار سال کی کوششوں میں کامیاب ہو کر اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ گیا ہے۔ ہدایت نبوت اور فلسفہ کا یہ اتصال انسان کے علمی ارتقاء کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے جو نوعِ انسانی کو ترقی کے ایک نئے دور میں داخل کرتا ہے۔ اس کے جو اہم نتائج پیدا ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ہدایت نبوّت اب ناقابل فہم عقائد کا مجموعہ نہیں رہی بلکہ اس کے اندر ایک ایسا عقلی استدلال پیدا ہو گیا ہے جو اس کی صداقت کے عقیدہ پر مجبور کرتا ہے۔ یہی وہ صحیح عقلی استدلال ہے جو اس کے اندر بالقوہ موجود تھا اور جو تمام فلسفوں کو چھوڑ کر صرف اسی کو حاصل ہو سکتا تھا۔

(۲) ایک عالمگیر اور منظم فلسفۂ کائنات کی صورت اختیار کرنے کی وجہ سے ہدایت نبوت کو ایک ایسی وضاحت حاصل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اب ہم وحی کے ارشادات کی غلط توجیہہ یا تفسیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا کریں تو نہ صرف وحی کے باقی ارشادات بلکہ تمام علمی حقائق اس کی مخالفت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حال اسلام کے اندر فرقوں کے حالیہ اختلافات کا علاج ہے اور آئندہ نئے فرقوں کے ظہور کا سد باب کرتی ہے۔

(۳) دُنیا کو پہلی دفعہ ایک ایسا فلسفۂ کائنات میسر آگیا ہے جو مجمل ہو تو ہو لیکن غلط نہیں ہو سکتا۔ اب فلسفہ کی ہر ترقی یا تو اس فلسفہ کی راہ سے ہو گی یا اسی کی مزید تفصیلات بہم پہنچائے گی۔ ورنہ وہ آخر کار کوئی ترقی ثابت نہ ہو گی۔

(۴) اسلام کی صحیح اور منظم واقفیت کی وجہ سے اب ہم اس کو دورِ حاضر کے مفکرین کے سامنے ایک علمی نظریہ کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں۔ گویا اب ہمارے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ ہم علی الاعلان اس کو اپنی سیاست، تعلیم، قانون اور ساری اجتماعی زندگی کی بنیاد بنائیں۔ کیونکہ اب ایسا کرتے ہوئے ہم

دنیا کی مخالفت نہیں بلکہ ہم نوائی کی امید رکھ سکتے ہیں۔

۵۔ ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ پراپیگنڈہ یا تبلیغ کی صورت میں دورِ حاضر کے تمام باطل نظریاتِ زندگی کے خلاف ایک ایسا کامیاب جہاد کریں جو نہ صرف اسلام کے دائرہ کے اندر بلکہ اس کے باہر بھی نوعِ انسانی اصلاح کرکے دنیا کے دائمی امن اور اتحاد کے لئے راستہ صاف کردے۔

The concept of God as the most fundamental of all truths is indispensable to Science as a system of truths. It must be used to illuminate the paths of scientific observation and inquiry in the worlds of matter, life and mind and to reveal new scientific truths which can never be known in its absence.

ISLAMIC EDUCATION

is a two-monthly journal which publishes articles explaining the theory and practice in that Perfect System of Education which is based on the Perfect Ideal, namely, God as defined by Islam.

OBJECTS

★ To present panoramic views on the contemporary sciences with the object of integrating them with the idea of God so that these sciences become God-appreciating, God-seeking and God-finding sources of human knowledge.
★ To establish the eternal truth of Islamic teachings in the light of latest researches.
★ To spell out in detail various aspects of theory and practice of Islamic education.
★ To review and critically examine the current theories of epistemology and education.
★ To conduct researches on academic works of Islamic thinkers.
★ To offer Islamic guidance on current problems of humanity.

Subscription { Annual Rs. 12/-
Per Copy Rs. 2/-

Can be had from

ALL-PAKISTAN ISLAMIC EDUCATION CONGRESS
7, Friends Colony, Multan Road, Lahore